© rasailojaraid.com

جبر و قدر کے درمیان انسانی راہِ عمل

از جناب نعیم صدیقی صاحب

(۲)

پچھلی قسط اُس جواب پر مشتمل تھی جو مَیں نے ایک صاحب کے سوال پر لکھا تھا۔ اب چونکہ یہ تحریر ترجمان القرآن میں شائع کی جا رہی ہے، اس لیے مزید دو ایک نکات کا اضافہ کر رہا ہوں جنہیں مسئلہ کو سمجھنے کے لیے سامنے رکھنا ضروری ہے۔

(۱) خدا نے اپنے علمِ پیشیں اور علمِ بعد از وقوعِ اعمال و حادثات میں خود ہی فرق کیا ہے۔

قرآن میں جہاں کہیں اس طرح کے ارشادات آتے ہیں کہ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ لِيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ۔ (اور تاکہ اللہ تم میں ایسے لوگوں کو جان لے — یا دیکھ لے — جو جہاد کرنے والے ہیں، اور جو صبر کرنے والے ہیں)۔ یا مثلاً یہ ارشاد کہ لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ (اللہ خبیث عنصر کو طیب عنصر سے الگ چھانٹ دے) یا فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (وہ تمہیں دیکھے کہ تم عملاً کیا رویّہ اختیار کرتے ہو)۔ اِن آیات کو سامنے رکھیں تو پوری بات نہ سمجھنے والے قاری کو اُلجھن ہوگی کہ آخر اللہ تعالیٰ جب غیب دان اور عالمِ احوالِ دوش و فردا ہے تو پھر اُسے دیکھنے، جاننے اور اہلِ خیر و شر کے چھنٹ کر الگ ہو جانے کا انتظار کیوں ہے؟

بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے علمِ پیشیں کی بنیاد پر کوئی حکم اور کوئی جزا و سزا انسان کے اُن اعمال پر وارد نہیں کرتا جو انسان اپنے محدود دائرۂ اختیار میں کرتا ہے، بلکہ وہ اس کی نیتوں، ارادوں، جذبات، خواہشات، افکار، منصوبوں اور اخلاقی اصولوں کے ظہور اور پیرایۂ عمل میں ان کے رُونما ہونے کے بعد اپنے قوانین و نوامیس کے تحت دنیا و آخرت کے لیے فیصلے صادر کرتا ہے۔

گویا انسانی ذمّہ داری کے دائرے میں اعمال کے وقوع پذیر ہونے کے بعد کے علم پر احکام اور فیصلے صادر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوتے ہیں (اگرچہ خدا کے علمِ پیشیں اور علمِ بعد از صُدورِ اعمال و واقعات میں کوئی تضاد نہیں ہوتا)۔ جزا و سزا کا اجرا اور اقوام و ملل کے عروج و زوال کے فیصلے علمِ بعد از وقوعِ اعمال و واقعات پر مبنی ہوتے ہیں۔

عدالتِ آخرت میں بھی کوئی فیصلہ اللہ تعالیٰ اپنے علمِ پیشیں کی بنیاد پر صادر نہیں فرمائے گا، بلکہ محض اپنے ذاتی علمِ بعد از وقوعِ اعمال و واقعات پر بھی نہیں ــــ وہاں تو ہر معاملے کا باقاعدہ تحریری ریکارڈ سامنے لایا جائے گا، اُس کی بنا پر مقدمات قائم ہونگے، سوالات کیے جائیں گے، انسان کے سامنے اس کے زندگی بھر کے کردار کے متعلق خارجی اور داخلی شہادتیں لائی جائیں گی، اس کے سینے کے مخفی اسرار، اس کے قلب کے پوشیدہ عزائم، اور اس کے ذہن کی تہ در تہ کیفیتیں ساری اس کے سامنے فاش کر کے رکھ دی جائیں گی۔ اُس دن آدمی اپنے آپ کو پوری طرح جانے گا کہ وہ کیا تھا اور کن پردوں میں اس نے اپنے آپ کو دوسروں سے چھپائے رکھا، اور کن خود فریبیوں سے اپنی حقیقت سے خود بھی آنکھیں چرائیں۔

عدالتِ آخرت کے سارے مقدمات علمِ بعد از وقوعِ افعال اور پھر اُن اعمال کی شہادتوں کے ریکارڈ پر مبنی ہوں گے۔

(۲) تمام موجودات کی طرح انسانی افراد اور اقوام اور حکومتوں اور تحریکوں سب کے لیے خدا کے ہاں ایک اجلِ مسمّٰی قرار پاتی ہے۔ اقوام کو اس نامعلوم اجلِ مسمّٰی تک (جو اللہ کے علم میں ہوتی ہے) مہلتِ کار یا رخصتِ عمل دی جاتی ہے اور اسے اقتدار یا ترقی کا موقع عطا کیا جاتا ہے۔ افراد کے لیے یہ مہلت زیادہ سے زیادہ طبعی عمر تک ہو سکتی ہے، اور اقوام کے لیے امکانی صورت میں یہ قیامت تک کے لیے بھی ہو سکتی ہے۔

لیکن ضروری نہیں کہ افراد یا اقوام لازماً اس اجلِ مسمّٰی تک ضرور پہنچیں جس کی گنجائش ان کے لیے رکھی گئی ہے۔ بلکہ جس طرح افراد جسمانی صحت کی تباہی کے وجوہ و عوامل کے شکار ہو کر وقت سے پہلے اپنا دورِ عمر ختم کر لیتے ہیں، اسی طرح اقوام اپنے غلط اخلاقی رویوں سے اللہ کی عطا کردہ "زیادہ سے زیادہ" مہلتِ کار یا رخصتِ عروج و اقتدار سے استفادہ کرنے سے محروم ہو جاتی ہیں اور ان کے لیے اجلِ مسمّٰی کا جو نشان مستقبل میں دُور کسی مقام پر لگا ہوتا ہے، اسے وہاں سے اٹھا کر مشیتِ الٰہی پیچھے لے آتی ہے۔ یہ بات کہتے ہوئے میرے سامنے وہ آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اقوام کو راست روی کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا کہ يُؤَخِّرْكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى (تاکہ وہ تم کو زیادہ سے زیادہ مہلت کی آخری حد تک زندہ رہنے، یا برسرِ اقتدار رہنے یا پھلنے پھولنے اور اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کا موقع دے)۔ اس موقع کو ضائع

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر دینے والی اقوام کو ایسے عالم میں یکدم (بَغْتَةً) دبوچ لیا جاتا ہے جب کہ وہ اپنی قوت، ترقی اور کامیابی پر جھوم رہی ہوتی ہیں یا عیش و تنعم میں مگن ہوتی ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ اگر اجل مسمّٰی غلط عملی روش کی وجہ سے پیچھے آسکتی ہے، تو صحیح رویے کی صورت میں وہ آگے بھی بڑھ سکتی ہے۔

اگرچہ ہر فرد و قوم کے متعلق اللہ تعالیٰ کے علم پیشیں میں یہ قطعی معلومات موجود ہیں کہ فلاں شخص اور فلاں گروہ خدا کی طرف سے دی گئی زیادہ سے زیادہ مہلت کی آخری حد تک جائے گا یا نہیں، اور کون اپنی اجلِ مسمّٰی کو اپنے اعمال کی وجہ سے قریب لے آئے گا، اور کون اسے آگے دُور تک بڑھوا لے گا، لیکن افراد و اقوام کو دیے جانے والے نتائج اللہ اپنے علمِ پیشیں کے بل پر نہیں دیتا، بلکہ ان کے اعمال نیک و بد کے صُدور کے بعد دیتا ہے۔

(۳) اس سلسلے میں توضیح کے لیے اگر قومِ یونس کی مثال کو سامنے رکھا جائے تو خاصی روشنی مل سکتی ہے۔ اس قوم میں ایک مرحلے پر بگاڑ اس حد تک آپہنچا تھا کہ خدا کی ناراضگی حضرت یونسؑ کے قلب پر واضح ہو گئی تھی، اور انھوں نے نگاہِ نبوت سے دیکھ لیا تھا کہ ان کی قوم پر عذاب کی تلوار بالکل لٹک گئی ہے۔ چنانچہ وہ مُعذّب ہونے والی قوم کو باقاعدہ اذنِ الٰہی سے پہلے ہی چھوڑ کر الگ ہو گئے۔

دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہیں گے کہ قومِ یونس اس وقت اپنی اجل مسمّٰی کو بالکل قریب لے آئی تھی۔ لیکن قرآن نے اس قوم کی یہ واحد مثال ہمارے سامنے رکھی ہے کہ ایسی شدید بداعمالیوں میں مبتلا ہونے کے بعد جو عذاب کو دعوت دینے والی تھیں، یکایک وہ اپنی گمراہی اور پستی کا احساس کر لیتی ہے اور خدا کے آنے والے عذاب سے خوف زدہ ہو کر آخری مرحلے میں توبہ و انابت کی راہ اختیار کر لیتی ہے جس کی توقع حضرت یونسؑ کو نہ تھی۔ اس توبہ و انابت کے ذریعے قومِ یونس نے ہاتھ سے جاتی ہوئی مہلتِ کار کو دوبارہ حاصل کر لیا، اور اس کی اجل مسمّٰی کا سنگِ میل یک دم دُور ہٹا کر فاصلہ بڑھا دیا گیا۔

اسی طرح قوم یہوؔد کے احوال کا مطالعہ کرتے ہوئے اگر اس طرزِ معاملہ پر غور کیا جائے جو مختلف مراحل میں خدا نے ان سے روا رکھا تو عرض کردہ حقیقت بہت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ سُورۂ بنی اسرائیل میں ان کی طرف سے دو بڑے ادوارِ فساد کے ظہور کا ذکر ہے، جن کے متعلق انھیں وارننگ دی جاتی ہے۔ مگر یہ قوم دونوں دفعہ وجہِ فساد بنتی ہے اور دونوں دفعہ ایسی کڑی سزا پاتی ہے کہ بظاہر دوبارہ سر اٹھانا ممکن نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نظر آتا۔ لیکن چونکہ مار کھانے کے بعد اس میں پھر رجوع الی اللہ پیدا ہوتا ہے، اس لیے اسے پھر خدا کی طرف سے مدد دے کر از سرِ نو مہلتِ کار دی جاتی ہے۔ اسی سلسلے میں آتا ہے وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ (اور اگر تم پھر ایسا ہی کرو گے تو ہم بھی تمہارے ساتھ ویسا ہی سلوک کریں گے)۔

(۴) ایک نہایت قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ اپنے قرآنی پیغامِ ہدایت میں خدا تعالیٰ نے انسان کو ایک آزاد و ذی شعور مخلوق کی حیثیت سے اپنے دین کے کام میں حصہ لینے کے لیے پکارا ہے۔ مثلاً یہ ارشاد کہ کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ (اللہ کے مددگار بنو)۔ یا یہ اندازِ کلام کہ اَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (اللہ کو قرضِ حسن دو)۔ یا یہ کہ کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ (انصاف کی علمبرداری کے لیے کھڑے ہونے والے بنو)۔

ظاہر بات ہے کہ اگر انسان کو دینی اور اخلاقی مسلک پر چلانے کے لیے جبریت کا طریقہ کارفرما ہوتا تو اسے پکارنے اور اس میں رضا کارانہ جذبہ یا آزاد ارادہ ابھارنے کی ضرورت نہ ہوتی۔

(۵) جبر و اختیار سے مرکّب زندگی کو سمجھنے کے لیے ایک مثال مدد دے سکتی ہے۔ ایک شخص کی ملکیت میں ایک موٹر گاڑی بھی ہے اور اس کی غلامی یا ملازمت میں ایک ڈرائیور بھی ہے۔ اب مکمل جبریت کا وہ مقام بالکل الگ سمجھ میں آسکتا ہے جو موٹر گاڑی کا ہے۔ موٹر گاڑی کے پُرزے اس طرح جوڑ دیئے گئے ہیں کہ وہ کسی صاحبِ دماغ ڈرائیور کے ہاتھوں مقررہ طریقے کے ساتھ چل سکتی ہے اور رک سکتی ہے۔ مگر موٹر کار کے ساتھ دماغ اور ارادہ موجود نہیں۔ وہ نہ بطورِ خود سمجھ سوچتی ہے، نہ دو راستوں میں سے کسی کا انتخاب کرتی ہے، اور نہ اس سے کسی غلطی یا گناہ یا خلاف ورزیٔ قانون کا صدور ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے ڈرائیور اگرچہ غلامی یا ملازمت کے بندھن میں بندھا ہوا ہے، وہ کفالت یا تنخواہ یا اُجرت کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے، اسے مختلف راستوں اور سڑکوں میں سے منزلِ مقصود کی طرف جانے کے لیے جگہ جگہ کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوتا ہے اور وہ حسبِ ضرورت موڑ کاٹتا ہے۔ اُسے سڑک پر نصب شدہ نشانات اور انتباہی اشارات کا بھی لحاظ رکھنا ہوتا ہے۔ وہ گاڑی چلانے میں مالک کی مرضی کے خلاف غفلت سے بھی اور دانستہ بغاوت و انحراف کے جذبے سے بھی، اور اپنے کسی محدود وقتی فائدے کی ہوس میں آکر بھی غلط طریق پر سوچ سکتا ہے، غلط ارادہ کر سکتا ہے، اور غلط رُخ پر یا غلط طریق سے گاڑی چلا کر یا تو کسی حادثے سے دوچار ہو سکتا ہے یا مالک کی ناراضگی مول لے سکتا ہے کیونکہ موٹر گاڑی کے بخلاف اسے دماغ اور قوتِ ارادی اور قوتِ فیصلہ حاصل ہے۔ اس کے ساتھ جذبات اور خواہشات موجود ہیں، اور وہ سمع و بصر سے آراستہ ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

موٹر گاڑی، انجینئر یا مالک کی مرضی پر بنے ہوئے نقشے سے انحراف نہیں کر سکتی۔ ڈرائیور اپنی مرضی ہی سے چاہے تو مالک کے احکام کی پابندی کرے، اور اس رویّے کا اچھا نتیجہ حاصل کرے، اور چاہے تو وہ ان احکام کی تعمیل میں گڑبڑ کرے یا مکمل بغاوت کا رویّہ اختیار کرے، اور پھر اس رویّے کا بُرا خمیازہ بھگتے۔

مسئلہ جبر و قدر میں اُلجھنے والے حضرات بالعموم انسان کو موٹر گاڑی کی سی پوزیشن دیتے ہیں جو فی الحقیقت خدا نے طبعی نظام میں کسی ہوئی کائنات کو دی ہے۔ حالانکہ وہ ایک پرورش کنندہ مالک کی غلامی میں کام کرنے والے ذی شعور و ذی ارادہ ڈرائیور کی حیثیت رکھتا ہے۔

مالک اپنے ڈرائیور کو ہدایات دیتا ہے، اسے پروگرام بتاتا ہے، اسے جادۂ سفر تجویز کر کے بتا دیتا ہے کہ فلاں سمت میں جانا ہے اور فلاں دوراہے پر یا چوراہے پر فلاں جانب مُڑنا ہے اور فلاں فلاں اطراف میں بڑھنے سے اجتناب کرنا ہے۔ ایسی ہدایات موٹر کار کو نہیں دی جاتیں۔ وہ تو بے بس آلۂ کار ہے۔ انسان ایسا سو فیصدی بے بس آلۂ کار نہیں ہے۔

(۶) تاریخ میں بے شمار واقعات ایسے سامنے آتے ہیں جنہیں تاریخ کے "اگر مگر" IFS AND BUTS OF HISTORY سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی اگر فلاں معاملے میں فلاں صورتِ حالات نہ پیدا ہو جاتی تو نتیجہ وہ نہ نکلتا جو نکلا۔

کسان فصل بوتا ہے، اسے پروان چڑھانے کے لیے دن رات محنت کرتا ہے۔ مگر بارش وقت پر نہیں ہوتی، اولے برس جاتے ہیں، گرم زہریلی ہوا چل جاتی ہے، فصل تباہ ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف کسی اور موقع پر کسان نے سرسری کام کیا ہے مگر موسمی حالات کی سازگاری نے بہت اچھا نتیجہ پیدا کر دیا۔

جنگِ خندق کے موقع پر ایسی شدید آندھی چلتی ہے کہ مدینہ پر حملہ آور ہونے والے لشکرِ جرار کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور سارے عرب سے جمع شدہ یہ قوت مقصد حاصل کیے بغیر بکھر کر واپس چلی جاتی ہے۔

یہ سب کیا ہے؟

بات یہ ہے کہ افراد کی زندگی میں بھی اور اقوام اور تحریکوں کی زندگی میں بھی انسانی سعی و جہد پر بہت بڑا اثر ایسے احوال و ظروف ڈالتے ہیں جن کے کسی خاص وقت پر پیدا کرنے میں انسان کا اپنا دخل یا تو بالکل نہیں ہوتا، یا نہایت ہی برائے نام اور غیر مؤثر ہوتا ہے۔ یہ احوال و ظروف مشیتی نظام سے تعلق رکھتے ہیں۔ کسی شخص یا قوم کو کیا قدرتی وسائل ملے؟ کیسی ذہنی و جسمانی صلاحیتِ کار ملی؟ کب کدھر سے کونسی دشمن یا دوست قوتیں اُبھر آئیں؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کب کس سے تصادم پیش آیا؟ اس تصادم میں قدرتی اور بین الاقوامی احوال کس طرح اثر انداز ہوئے؟ اقتصادی ترقی کے لیے کبھی یکایک نئے معدنی، کیمیاوی یا سائنسی تحقیق کے ذریعے منکشف ہونے والے وسائل ہاتھ آجاتے ہیں۔ کبھی تجارتی عروج کے لیے بین الاقوامی منڈیوں میں کوئی سازگار صورت نمودار ہو جاتی ہے۔ کبھی معاملہ اس کے برعکس پیش آتا ہے۔ یہی حالات سیاسی اقتدار کے اِدھر سے اُدھر منتقل ہونے میں دیکھے جاتے ہیں۔

قرآن میں جابجا امتِ محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بھی اور سابق انبیاء کی قوموں سے بھی ایسے وعدے کیے گئے ہیں کہ اگر تم راست روی اختیار کرو تو آسمان سے تم پر بارانِ رحمت برسے گی، یا یہ کہ خدا اولاد و اموال میں اضافہ کر کے تمہاری قوت بڑھائے گا۔

ایسے وعدوں کا تعلق اُسی مشیّتی نظام سے ہے جو موسمی اور طبعی دائرے سے لے کر تاریخی اور تمدنی دائرے تک نت نئے احوال و ظروف کو ظہور دیتا ہے۔ جب خدا چاہتا ہے تو کسی فرد یا قوم کے لیے احوال و ظروف زیادہ سازگار ہو جاتے ہیں اور جب وہ چاہتا ہے تو ان کی ناسازگاری میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

لیکن اس جبریت سے انسان کے محدود اختیارات اور اس کی اخلاقی ذمہ داری میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کو مختلف حالات (SITUATIONS) سے گذار کر ان کی آزمائش کرتا ہے کہ وہ سازگار حالات میں کیا روش اختیار کرتے ہیں؟ اور ناسازگار حالات میں وہ خدا پرستی اور نیکی کی راہ پر قائم رہنے کے لیے کہاں تک زور لگاتے ہیں؟ دونوں صورتوں میں ان کی سوچ بچار کیسے کام کرتی ہے؟ وہ قوتِ فیصلہ سے کس طرح کام لیتے اور کیا ارادے باندھتے ہیں؟ اور پھر ان کو جامۂ عمل پہنانے کے لیے عملی ذمہ داریاں کہاں تک انجام دیتے ہیں؟

بدلتے ہوئے احوال و ظروف، خصوصی واقعات، اتفاقی حوادث کو انسانی زندگی میں جو وسیع دخل حاصل ہے، اسی کو ملحوظ رکھتے ہوئے خدا پرست افراد و اقوام خدا کی رضا طلبی کی کوششوں کے ساتھ ساتھ اس سے مدد کی دعائیں کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اپنے مشیّتی نظام میں تصرفات فرما کر طرح طرح کے کرشمے دکھاتا ہے۔

البتہ احوال و ظروف کی سازگاری اور ناسازگاری، اور حالات کی نت نئی مفید اور مضر کروٹوں کے بارے میں ہم تفصیل سے یہ نہیں جان سکتے کہ مصلحتِ الٰہی کیا ہے؟ کیونکہ اس کے سامنے بے شمار مخلوق، بے شمار انسانی افراد، اور بے شمار انسانی گروہوں کے بے حد وسیع معاملات ہوتے ہیں، درآنحالیکہ ہماری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نکر محض ایک محدود دائرے میں نگاہیں مرتکز کر کے کام کرتی ہے۔

(۱) مستفسر صاحب کے خط میں سوالات کا ایک جُز یہ بھی تھا جس کا جواب پہلے لکھا نہیں جاسکا کہ کیا وجہ ہے کہ جو بچہ کسی مسلمان گھرانے میں پیدا ہو جاتا ہے وہ مسلمان ہوتا ہے اور جو بچے کسی دوسرے مذہب والوں یا ملحدوں یا اشتراکیوں کے گھروں میں پیدا ہوتے ہیں وہ اپنے خاندان ہی کا راستہ اختیار کرتے ہیں؟

یہ بات تو خود حدیث ہی میں مذکور ہے کہ ہر بچہ فطرتِ اسلام لے کر پیدا ہوتا ہے (یعنی اس میں ایسے داعیات و رجحانات کارفرما ہوتے ہیں کہ اگر ان کو کام کرنے کا موقعہ ملے تو وہ تلاشِ حق کا سفر طے کر کے اسلام تک جا پہنچے گا) مگر اس کے خاندان والے اسے یہودیت یا عیسائیت کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔ ملکہ مُستزاد یہ کہ وہ اسے تلاشِ حق اور جستجوئے صداقت کے جذبۂ عالی سے محروم کر کے تعصبات کے بندھنوں میں جکڑ دیتے ہیں۔

کہا جاسکتا ہے کہ جب یہ صورت ہے تو پھر غیر مُسلم خاندانوں میں پلنے والے بچوں کا کیا قصور؟ بات بڑی زوردار ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ایک اہم حقیقت یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ ہر انسان کے ذہن میں سوال اٹھانے کی قوت رکھی گئی ہے، اور ہر آدمی بلوغ کو پہنچ کر جب عقل سے کام لینے کے قابل ہو جاتا ہے تو طرح طرح کے سوالات تنہائی میں، گفتگوؤں میں، مطالعہ کرتے ہوئے اس کے دل میں اُبھرتے ہیں۔ اس کا ضمیر اس سے ضرور پوچھتا ہے کہ تم جو زندگی بسر کر رہے ہو کیا اس پر مطمئن ہو کہ یہ ٹھیک ہے؟ تم نے جس مذہب یا تحریک کو اپنے خاندان یا اپنی قوم سے لیا ہے کیا وہ پُورے کا پُورا برحق ہے اور تمہارے لیے اور انسانیت کے لیے باعثِ فلاح؟ اور اس کے برحق ہونے کے کیا شواہد تمہارے پاس ہیں؟ اس کے علاوہ جو عقیدے، نظریے، مذاہب اور تہذیبی نظام پائے جاتے ہیں کیا تم نے ان کا جائزہ لے کر یہ جاننے کی کوشش کی کہ تمہارے اختیار کردہ راستے سے زیادہ بہتر کوئی دوسرا راستہ ہو؟

عام لوگ ان چُبھتے ہوئے سوالوں کو، جن کے جواب تک پہنچنے کے لیے محنت درکار ہوتی ہے: نذرِ تغافل کر دیتے ہیں اور ان کو ذہن سے نوچ کر لاشعور میں دھکیل دیتے ہیں۔ پھر اطمینان سے بنے بنائے نقشۂ زندگی میں مگن ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں نے مسلکِ آبا پرستی اختیار کیا کہ ہمارے آباؤ اجداد اور بزرگانِ سلف نے جو کچھ صحیح سمجھا وہ طے کر دیا۔ اب نہ کسی الہامی سند کی ضرورت، نہ کسی عقلی کاوش کی لیکن یہ سوالات آدمی کو مرتے دم تک چھوڑتے نہیں۔ وہ بار بار لاشعور کے بِل سے نکل کر اس کے قلب و دماغ کو ڈستے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں۔ اور تغافل و تساہل کے مرض انہیں بار بار نوچ کے پھینکتے رہتے ہیں۔ آخرت کی جوابدہی انہی سوالات کی بنا پر ہوگی کہ تمہارے دل میں ہماری دی ہوئی فطرت نے جو سوالات مسلکِ زندگی کی صحت و نادرستی کو جانچنے کے لیے بار بار اُبھارے تھے ان کا جواب معلوم کرنے کے لیے تم نے کیا کیا؟

دوسری طرف آپ کو ایسی ہستیاں ملتی ہیں کہ جنہیں ایک خاص طرز کا غلط ماحول پروان چڑھاتا ہے اور وہ ان کو اپنے رنگ میں رنگنے کے تمام وہ مروج اسلوب کام میں لاتا ہے جو بے شمار افراد پر کامیاب رہتے ہیں لیکن یہ ہستیاں ماحول کے اِس جبری سانچے کے خلاف لڑنے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوتی ہیں جس میں انہیں بچپن سے ڈھالنے کی ہر ممکن تدبیر کی جا چکی ہوتی ہے۔ آخر حضرت موسیٰ کس ماحول سے اُبھرتے ہیں؟ حضرت ابراہیمؑ کس خاندان میں آنکھ کھولتے ہیں؟ نبی آخر الزماںؐ کیسی قوم کے نظامِ تربیت کے زیرِ سایہ آنکھ کھولتے ہیں؟ جدید دَور کی عام دنیوی نوعیت کی مثالیں لیجیے۔ وہ لوگ کیسے اُبھرے جنہوں نے جبری بادشاہیوں کے سائے میں پل پوس کر برطانیہ، فرانس اور امریکہ میں جمہوریت کا علم بلند کیا؟ زارِ روس کے استبداد کے شکنجے میں کسی ہوئی قوم کے اندر سے باغیانہ رجحان نمودار ہوا۔ سرمایہ دارانہ معاشرے میں نشو ونما پانے والے کارل مارکس نے اشتراکی نظریہ پر مبنی پرولتاری انقلاب کے خطوط تجویز کیے۔ خود ہمارے برِّصغیر میں انگریزی استبداد کے اندر رہنے والی آبادی میں آزادی کی تحریک برپا کرنے والے مسلم اور ہندو لیڈر اُبھرے۔ اسی طرح ہندو اکثریت کے مُسلم دشمن سامراجی عزائم کے بے نقاب ہو جانے پر اقبال نے فکری محاذ پر اور قائدِ اعظم نے آئینی سیاست کے محاذ پر ماحول سے جنگ آزمائی کی۔ اور ساری تاریخ کی رونق ایسی ہی ہستیوں سے ہے جنہوں نے بچپن سے ایک خاص طرح کی تربیت دینے والے ماحول کے دھارے کے خلاف پیرنے کی جرأت کی۔

ان مثالوں سے یہ ظاہر ہے کہ انسان میں قدرت نے ایسی صلاحیتیں رکھی ہیں اور ایسے محرکات ودیعت کیے ہیں کہ وہ خوفناک ترین ماحول کے پنجرے سے — خواہ وہ خاندانی ہو، یا سماجی یا سیاسی واقتصادی — لڑ سکتا ہے۔ وہ اس کے خلاف باغیانہ طرز پر سوچ سکتا ہے۔ وہ ایسی تربیت اور ایسی تعلیم کے خلاف بھی ناقدانہ اور باغیانہ طرزِ فکر کو کام میں لا سکتا ہے جس کے ذریعے اس کے ذہن و کردار کو ایک خاص شکل دینے کی کوشش مسلسل کئی برس تک کی گئی ہو!

آخر مشرکینِ مکہ کے بُت پرست معاشرے میں وہ چند نفوس بھی تو پوری طرح نمایاں ہیں جو حضور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خاتم النبیین کی بعثت سے قبل شرک اور مشرکانہ رسُوم سے بیزار ہو کر سچی براہیمیت کا راستہ تلاش کرنے کے لیے مضطرب رہے اور بعض نے بڑی بھاری جدوجہد کی؟

اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کسی غلط ماحول میں پرورش پانے کے باوجود اُس کی غلطیوں اور خرابیوں کا شعوُر حاصل کر سکتا ہے، اس سے بیزار ہو کر صحیح راستے کی جستجو میں پڑ سکتا ہے، اور اگر اسے کوئی صحیح یا بہتر راستہ مل جائے تو وہ ماحول سے لڑ سکتا ہے۔ وہ عام لوگ جو داخلی محرکات کے موجود ہونے کے باوجود یہ پارٹ ادا نہیں کرتے وہ دراصل تساہُل و تغافُل کا شکار ہوتے ہیں۔ اور زندگی کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کے مسئلے میں تساہُل و تغافل کا رویہ خدا کے ہاں جُرم ہے۔ زندگی کا صلاح و فساد اتنا چھوٹا مسئلہ نہیں کہ اس کی پروا نہ کرنے والے انسانوں سے کوئی تعرض نہ ہو۔

یہ الگ بات ہے کہ کسی کو سعیِ تلاشِ حق کی راہ پر گامزن ہوتے ہوئے اگر فی الحقیقت لاینحل ذہنی یا خارجی موانعات پیش آئیں تو خدا کی عدالت ان کی رعایت دے دے۔ مگر جذبۂ تلاشِ حق سے کام لے کر امکانی حد تک سعی کرنے کا مکمل فقدان لازماً ایک جُرم ہے۔

اب رہا ہم مسلمانوں کا معاملہ، سو ہمارے ہاں کمی یہ ہے کہ اسلام کو شعوُری طور پر پیش کرنے اور عمل سے اس کی صداقت کی گواہی دینے کے لیے نظامِ ریاست کے پیمانے پر کوئی جامع اور ہمہ گیر تحریک مدتوں کارفرما نہیں رہی۔ حالات نے جس حد تک گنجائش دی، افراد اور اداروں نے محدُود صورت میں حق کی گواہی دینے اور اسلام کی دعوت کا علم بلند کرنے کا کام ضرور کیا۔ لیکن زندگی کے تمام شعبوں، تمام ممالک اور تمام طبقوں اور عناصر میں اسلام کا تحریکی عمل تسلسل سے جاری نہیں رہ سکا۔ بخلاف اس کے بہت سی مخالفانہ تحریکیں کارفرما ہوتی رہیں جن میں نیشنلزم اور سیکولرازم سے لے کر سوشلزم اور کمیونزم تک سبھی کو شمار کرنا چاہیے۔

اسلامی تحریک اگر کام کر رہی ہوتی تو وہ اُسی طرح مُسلم اور غیر مُسلم حلقوں سے اپنے لیے ایمان و شعور رکھنے والے کارکُن حاصل کرتی، جیسے وطنیت اور نسلی قوم پرستی اور سیکولرازم اور سوشلزم کی تحریکیں آج ہم مسلمانوں کے گھرانوں میں سے اپنے لیے کارکُن حاصل کر کے ان کو اسلام کے خلاف اور ہم مسلمانوں کے خلاف استعمال کرتی ہیں۔

اسلامی تبلیغ کی منفرد کوششوں کے باوجود، اسلامی تحریک کے برسرِعمل نہ ہونے کی وجہ سے اسلام صرف خاندانی راستے سے بطور ایک میراث کے ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہونے لگا۔ یہ بھی غنیمت ہوتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مگر بدقسمتی سے وہ پُورا اسلام نہیں ہے جو خاندانوں کے ماحول سے مسلمانوں کو ملتا ہے بلکہ وہ محض ایک جذباتی اور روایتی وابستگی، ایک غیر شعوری ایمان اور زیادہ تر ایک غیر عملی عصبیت ہے جو خاندانی ماحول مسلمانوں کی اولادوں کو دے رہا ہے۔ اسلام سے یہ کمزور قسم کی وابستگی اس مصیبت کا باعث بنی ہے کہ ہمارے ہاں فکر و عمل کے خوفناک تضاد پائے جاتے اور منافقت کی رنگا رنگ اقسام رائج ہو گئی ہیں۔

بہر حال یہ ذمہ داری تو ہم مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے کہ ہم اپنے خاندانوں کے ماحول سے ملنے والے اسلام کے بارے میں اپنے ضمیر سے اٹھنے والے سوالات کی روشنی میں یہ جاننے کی کوشش کریں کہ ہمیں جو کچھ میراث میں ملا ہے وہ کیا ہے؟ اس کی ضرورت و اہمیت پر غور کریں؟ اس کے بارے میں یہ جانیں کہ اس کے ایمانی و شعوری سرچشمے کیا ہیں اور ان کے ذریعے یہ معلوم کریں کہ اس دین یا نظام کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اس کے تقاضے کیا ہیں؟ اور پھر سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں کہ آیا ہمیں صحیح اور مکمل اسلام کو لے کر چلنا ہے، یا اپنے ضمیر دل سے اٹھنے والے سوالات کو کچل کر اپنے آپ کو اسی بے معنی حالت میں مبتلا رکھنا ہے جس پر کسی نہ کسی حد تک اس ارشادِ الٰہی کا اطلاق ہو سکتا ہے کہ لَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ۔ یعنی نہ اِدھر کے، نہ اُدھر کے۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم کی اس کیفیت کی پوری ذمہ داری خاندان اور معاشرے کے ماحول پر نہیں ڈالی جا سکتی، بلکہ بلوغ کو پہنچنے والا ہر فرد اپنے ذہن کی اُن استفہامی تحریکات کی بنا پر جوابدہ ہے جو اس کے اندر سمندر کی موجوں کی طرح اٹھتی رہتی ہیں، اور جن سے وہ بڑی حد تک باخبر ہوتا ہے (علیٰ نفسہٖ بصیرۃ)

(۸) اوپر کے اشارات سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ خدا نے نظامِ مشیت اور نظامِ تکوینی کے لیے قوانین و نوامیس کی جو مشینری بنا دی ہے، اسے چلا کر وہ بے تعلق ہو گیا ہے، اور اب کسی طرح کے تصرف و مداخلت کا صدور اس کی طرف سے نہیں ہوتا۔

چونکہ اس کائنات کے مشیتی و تکوینی نظام میں اس نے ارادہ، علم اور قوتِ فیصلہ رکھنے والی ایک مخلوق احسنِ تقویم پر پیدا کی ہے، اس لیے اس مخلوق کے رویوں کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ طبعی اور تاریخی دونوں طرح کے احوال و ظروف میں بعض خاص تصرفات فرماتا ہے۔ وہ افراد اور اقوام کے لیے مختلف مراحل میں اور مختلف مواقع پر مختلف حالات کی ترتیب کو تبدیل کرتا رہتا ہے۔ کبھی نصرت و تائید کے لیے، کبھی سزا و تادیب کے لیے، کبھی آزمائش کے لیے اور کبھی تربیت کے لیے وہ افراد و اقوام کو ان کے رویوں کے مطابق مختلف قسم کے احوال سے دوچار کرتا ہے جن میں بعض آہستہ آہستہ سلسلۂ علت و معلول کے تحت رُونما

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوتے ہیں، اور بعض غیر متوقع اور نادیدہ صورتوں میں۔

افراد اور اقوام کے رویّوں کی تبدیلی کے ساتھ تکوینی اور طبعی اور تاریخی احوال میں ایسی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جن کا جوڑ کائنات کے تکوینی و طبعی ضابطوں کے رُو سے آپس میں نہیں لگایا جاسکتا۔

یہی حقیقت ہے جس کی بنا پر توبہ و انابت اور دعا و عبادت کو اہمیت حاصل ہے۔ یہ مظاہر خدا پرستانہ رویّے کی روحِ رواں ہیں۔ ہم دعا اِسی شعور کے تحت مانگتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے قائم کردہ تکوینی و مشیتی نظام میں تصرف کے بالاتر اختیارات حاصل ہیں، وہ کسی دوسری طاقت کے بنائے ہوئے قوانین کا پابند نہیں ہے، بلکہ اپنے بنائے ہوئے قوانین پر چلنے والے نظامِ وجود کا فرماں روائے مطلق ہے۔

یہ سوال کہ جب قوانین بنا دیے گئے تو پھر تصرّفِ خاص کے کیا معنی؟ اس کے جواب میں پچھلے نکات کی روشنی میں یہ حقیقت خود بخود واضح ہوجانی چاہیے کہ خود اس تصرّفِ خاص کے لیے بھی خدا نے کچھ قوانین وضع کیے ہیں جو انسانوں کے اخلاقی رویّوں اور تکوینی و تاریخی قوانین کے عمل میں ایک ایسا ربطِ پنہاں پیدا کرتے ہیں جسے خالص طبعی قوانین اور تاریخی ضابطوں کی بنا پر دریافت نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بالاتر حقیقت محض الہامی علم کے ذریعے واضح ہوتی ہے۔

(۹) آخر میں مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ مجھے کوئی ایسا مسلمان نہیں ملا جو جبریّتِ کاملہ کے غیر معتدل تصوّر کا کٹر سے کٹر علمبردار ہوتے ہوئے بھی، زندگی کے معاملات کو اس تصوّرِ جبریّت کے مطابق چلائے یعنی اگر کھانے یا پہننے کو کچھ نہ ملے تو وہ کوئی تگ و دَو نہ کرے، اور بچّہ بیمار پڑ جاتے تو اس کے علاج کے لیے ہاتھ پاؤں نہ مارے، یا کوئی درندہ اس پر جھپٹنے والا ہو تو بچاؤ کی تدبیر نہ کرے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ اس غیر اسلامی نظریۂ جبریّت کا عملی اطلاق صرف دینی و اخلاقی ذمہ داریوں کے دائرے ہی میں کیا جاتا ہے۔

مَیں کہتا ہوں کہ جو رویّہ ہم دائرۂ معاش میں اختیار کرتے ہیں، وہی معاد میں کیوں اختیار نہیں کرتے؟ اور پھر اسی رویّے کے مطابق جبر و قدر کا وہ صحیح و متوازن تصوّر کیوں نہیں اپناتے جو اسلام دے رہا ہے۔

© rasailojaraid.com